مطالعۂ سیرت کا مادی منہج- تجزیاتی مطالعہ

صباحت افضل*

پروفیسر ڈاکٹر محمد حماد لکھوی*

The importance of the study of Seerah for a true understanding of Islam is undeniable. For this reason Seerah has been one of the most popular subjects among Muslims scholars and readers since the earliest period of Islam. With the passage of time different methodologies for Seerah writing have been introduced. However, all these approaches regarding Seerah writing are not unquestionable. The biggest challenge with regard to Seerah writing which the Muslim scholars are facing today is to highlight the fallacies committed by those Seerah writers who try to see the life of the Prophet (P.B.U.H) with all the lenses except those given by Quran and Hadith and the works of early Muslim Seerah writers. This article deals with that method of Seerah writing in which certain Western ideas are applied to study the life of the Prophet (P.B.U.H). It aims to point out the fallacies of this method in the light of authentic Seerah sources.

تاریخِ مذاہب کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ جب بھی کسی خطہ میں کسی نئی فکر و نظریہ نے جنم لیا تو اسے قبول کرنے والوں اور سراہنے والے لوگوں کے ساتھ ساتھ اس کے مخالفین کا ایک طبقہ بھی وجود میں آیا جس نے زبان اور ہاتھ دونوں سے اس نئی سوچ کو رد کرنے اور کچلنے کی کوشش کی۔ اسلام بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں رہا۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی سے دین حق کے منکرین کے مخالفانہ ہتھکنڈوں کی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مخالفت کی یہ مہم جو زبانی الزامات سے شروع ہوئی، اذیت رسانی کے انفرادی واقعات سے بڑھ کر ایک منظم و مسلح جنگ کی صورت اس وقت اختیار کر گئی جب اہل مدینہ نے آپ کو پناہ دے دی اور قریش کی تمام تر دھمکیوں کے باوجود آپ کو ان کے حوالے نہیں کیا۔ مکہ میں مخالفین اسلام نے اسلام کی طرف راغب ہونے والوں کو بدظن کرنے کے لیے آپؐ کی ذات پر الزام لگانے کے ساتھ ساتھ آپ کی طرف نازل ہونے والی وحی کی بھی مختلف تعبیریں کیں۔ مثلاً، یہ کلام جو آپ سناتے ہیں در حقیقت شاعری ہے، یا یہ کہ آپ کوئی جادوگر ہیں جو اس جادوئی منتر کے ذریعہ لوگوں کے دلوں کو مسحور کرلیتے ہیں۔1

تاریخ کے مختلف ادوار میں جہاں اسلام کی دعوت و پیغام نئی نئی قوموں تک پہنچتا رہا، وہاں اس کے

*لیکچرار شعبہ علوم اسلامیہ، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور۔

*پروفیسر، ادارہ علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب، لاہور۔

مخالفین کی طرف سے اس کی مخالفت و تنقید کے بھی نت نئے اسلوب ایجاد ہوتے ہے۔ تاہم ان تمام اسالیب و مناہج میں جو بات مشترک رہی وہ قرآن اور پیغمبر اسلام پر تنقید تھی۔ اس حوالے سے اہل مغرب نے خصوصی بیڑا اٹھایا۔ یورپ میں اسلامی علوم کی تعلیم کا پہلا قدم 1539ء میں فرانس کے ایک کالج میں عربی زبان کا شعبہ کھول کر اٹھایا گیا۔ رفتہ رفتہ اسلامی علوم سیکھنے کی یہ تحریک مزید منظم و وسیع ہوتی گئی۔ تحریک استشراق میں اہم ترین موڑ اس وقت آیا جب مستشرقین نے پیغمبر اسلام کی ذات کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنانے کی بجائے آپ کی تعلیمات اور آپ کی دعوت و تبلیغ کی مادی تشریح کرنے کا منہج اختیار کر لیا۔ یعنی بجائے اس کے کہ آپ کو براہ راست کاذب کہہ کر قارئین کے سامنے اپنا اصل متعصب چہرہ لایا جائے، انہوں نے اس حکمت عملی کو زیادہ کار آمد سمجھا کہ بظاہر آپ کو سچا اور امانتدار قرار دے کر قارئین کی توجہ بھی حاصل کر لی جائے اور پھر آپ کی تعلیمات کو اصل سیاق سے ہٹا کر اور تاریخ کو مسخ کر کے آپ کو محض ایک عام شخص کی حیثیت سے پیش کیا جائے جس کے پیش نظر محض اپنا دنیوی مفاد یا زیادہ سے زیادہ اپنی قوم کا دنیوی مفاد تھا۔ یعنی آپ کی تعلیمات کے روحانی و اخروی پہلو کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا جائے۔ تاہم مطالعۂ سیرت کا یہ مادی منہج صرف مستشرقین تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ استشراقی افکار کی وسیع اشاعت کے سبب بعض مسلم دانشور بھی اس سے متاثر ہوئے اور اس نہج پر سیرت طیبہ کی تشریح کرنے کی کوشش کی جس سے مقام رسالت گھٹانا تو ہرگز مقصود نہ تھا تاہم جو آپ کی تعلیمات کی ناقص و خام تعبیر کا سبب ضرور بن گیا اور بعض اوقات اہم تاریخی واقعات کے انکار کی بھی وجہ بنا۔ آنے والی سطور میں اِس منہج کا جائزہ لیا جائے گا جو حیاتِ طیبہ کی مادی تعبیر کرتے ہوئے مستشرقین کے ساتھ ساتھ بعض مسلم سیرت نگاروں نے بھی اختیار کیا۔

سیرت پر مغربی فلسفہء تاریخ کا اطلاق کرنا

سیرت طیبہ کے مطالعہ کا جو منہج اہل مغرب نے اختیار کیا اس کی ایک اہم خصوصیت فلسفۂ تاریخ کا اطلاق ہے۔ اگرچہ ماضی کے واقعات علم تاریخ کا موضوع ہیں تاہم ان واقعات کے مطالعہ سے جو اصول اخذ ہوتے ہیں وہ محض گزشتہ زمانے کے لئے خاص نہیں ہوتے بلکہ عمومیت رکھتے ہیں۔ علم تاریخ کی اسی اہمیت کے پیش نظر اسے مختلف پہلوؤں سے پروان چڑھایا گیا اور تاریخ محض واقعات کے ایک مسلسل بیان کا نام نہیں رہا۔ بلکہ ان تاریخی واقعات کی وضاحت، ان کے اسباب و نتائج کا تجزیہ بھی ایک بہترین

مؤرخ کے لئے لازمی ٹھہرا۔ تاریخی واقعات سے محض خاص اصول ہی اخذ نہیں کئے گئے بلکہ فلسفۂ تاریخ کے نام سے یورپ میں جو علم وجود میں آیا اس میں واقعات کی تشریح و توضیح خاص نظریات کی روشنی میں کی جانے لگی۔

فلسفۂ تاریخ بنیادی طور پر دو قسم کے سوالات سے بحث کرتا ہے۔ اول یہ کہ تاریخ کی اہمیت و مقصد کیا ہے؟ دوسرا یہ کہ وہ بنیادی قوانین کون سے ہیں جو تاریخی تغیرات کا سبب بنتے ہیں۔ گویا فلسفۂ تاریخ کی رو سے تاریخی قوانین کو ایک معروضیت حاصل ہے۔ یورپ میں اس نظریے کے علمبرداروں میں Vico، Herder، Hegel، Comte، Marx، Buckle، Spengler، Arnold Toynbee اور Pitirim Sorokin کے نام نمایاں ہیں۔ یہ تمام جدید مغربی فلاسفہ اس نقطۂ نظر کے حامل ہیں کہ علم تاریخ ایسے موضوعات پر محیط ہے جو عام مؤرخ کی نگاہ سے اوجھل رہتے ہیں۔ چونکہ اہل مغرب انسانی تاریخ کو عقلیت اور مادیت کی اس عینک سے دیکھتے ہیں جو یورپ کے صنعتی انقلاب اور مذہبِ عیسائیت میں اصلاحات کے بعد مستقل ان کی نگاہوں پہ چڑھ گئی، اس لئے وہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ کو بھی انہی مادی اصولوں کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاریخ کی مشہور مادی تعبیر جو مارکس نے کی وہ ہیگل کے اُس فلسفہ پر مبنی تھی جس کی رو سے اس نے تاریخ کے ہر دور کو ایک وحدت قرار دیا۔ فلسفۂ ہیگل کے مطابق جب تاریخ کا قافلہ آگے بڑھتا ہے تو آگے چل کر خود اس دور کے اپنے ہی بطن سے پرورش پا کر اس کا ایک حریف میدان میں نمودار ہوتا ہے۔ یعنی کچھ نئے افکار و نظریات خود اس روبہ زوال دور کے طبعی تقاضے سے پیدا ہو جاتے ہیں اور پرانے افکار سے نبرد آزما ہو جاتے ہیں۔ کچھ مدت تک یہ قدیم و جدید نظریات باہمی کشمکش کا شکار رہتے ہیں۔ بالآخر ان کے امتزاج سے ایک نئی تہذیب و تمدن جنم لیتا ہے جس میں پرانی تہذیبوں کے بعض عناصر برقرار رہتے ہیں۔ کچھ سال گزرنے جانے کے بعد یہ نظریات بھی روبہ زوال ہو جاتے ہیں اور پھر وہی مراحل ایک بار پھر دہرائے جاتے ہیں۔2

ہیگل کے اس فلسفہ تاریخ کو سیرت پر منطبق کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ آپ کی تعلیمات کو اس دور کے حالات کا طبعی نتیجہ قرار دے کر اس کے روحانی پہلو کو گھٹانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر عرب مصنف عبدالرحمن شرقاوی قبل از بعثت حالات کی کچھ یوں منظر کشی کرتے ہیں کہ قاری اس بات کا قائل ہو جائے کہ جاہلی عرب معاشرے کا حقیقی مسئلہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور کمزور

طبقے کا استحصال تھا، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا حقیقی مقصد بھی محض اسی معاشرتی و معاشی ناہمواری کا خاتمہ تھا۔ ایک مقام پر وہ لکھتے ہیں:

وأصحاب السلطة والحكام كلهممن التجار الكبار أصحاب رؤوس الأموال أوأصحاب المزارع البعيدةالتى ترب يفيها الخنازير، وتستقطر فيها الخمور ... كانوا من أصحاب المصارف والمرابين وملاكالخمارات وبيوت الله والضخمة... ومنأ جلذلكفما كان التشريع فى مكة ليهت مبأحد غيرهؤلاءالملاكالكبار الحاكمين3

(تمام اصحاب قوت واقتدار یا تو بڑے بڑے تاجر تھے یا ایسے صاحب ثروت طبقہ سے تعلق رکھتے تھے یا وسیع و عریض زمینوں کے مالک تھے جن میں خنزیر پالے جاتے اور جن میں (پھلوں سے) شراب کشید کی جاتی تھی ...ان میں سے بعض بینکوں والے (اصحاب المصارف) یا پھر سود خور تھے اور یا شرابوں والے باغات کے مالک یا زبردشت عیش و عشرت سے بھرپور گھروں کے مالک ...اس وجہ سے مکہ میں ایسی قانون سازی کیسے ممکن تھی جو صاحب اقتدار و ملکیت لوگوں کے علاوہ کسی اور کے حقوق کا تحفظ کرے۔)

مکہ کے بااثر طبقے کے مال و دولت کا نقشہ کھینچ کر مصنف یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ امیر و غریب کے مابین اس کشمکش کا طویل عرصے سے مشاہدہ کر رہے تھے، غربت کو مکی معاشرہ کے ناسوروں کا اصل سبب سمجھتے تھے اور اس معاشرے میں ایک غیر مراعات یافتہ شخص کے طور پر وہ خود کو تنہا بھی محسوس کرتے تھے، ایک مقام پر وہ لکھتے ہیں:

كان محمدقدشهد كل هذا، وقد ضاقبصور الحياة من حوله... وكان قد شعر أيضاً بأنعمه أباطالب، اذا مضيمعالقافلة وتركه، فسيبقى هو وحيداًفى مكة المت لاطمة بصراع التجار مع المستضعفين، وحيداً...4

(محمد نے یہ سب دیکھا تھا اور اپنے ارد گرد حیات کی اس تنگی کو محسوس کیا تھا ...اور وہ یہ بھی محسوس کر چکے تھے کہ جب ان کے چچا ابو طالب انہیں چھوڑ کر قافلہ (تجارت) کے ساتھ چلے جائیں گے تو وہ تلاطم خیز مکہ میں تاجروں اور کمزوروں کے مابین جاری اس کشمکش میں تنہا رہ جائیں گے، بالکل تنہا...)

مصنف افسانوی انداز میں سیرت رسول کو پیش کرتے ہوئے یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ اپنے والد، والدہ، دادا اور چچا ابو طالب سب کی زندگیوں میں غربت کو ایک اہم ترین مسئلے کے طور پر دیکھتے تھے:

فھو یفکر فی أبی ھالذیقتله السع یعلی الرزق، وفی أمه، وجدّہ، وفی عمه أبی طالب الفقیر وأعمامه الآخرین الأغنیاء... 5

(پس وہ غور و فکر کیا کرتے تھے، اپنے والد کے بارے میں جنہیں رزق کے لئے بھاگ دوڑ نے قتل کر ڈالا تھا، اپنی والدہ، اپنے دادا، اپنے غریب چچا ابو طالب اور اپنے دیگر امیر چچاؤں کے بارے میں۔)

مصنف کے ان مندرجہ بالا تصورات کی بنیاد کوئی تاریخی حقیقت نہیں۔ سیرت کی کتابوں سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ بعثت سے قبل آپ ﷺ کو خلوت نشینی محبوب ہو گئی تھی۔ لیکن یہ کہنا کہ آپ ﷺ ان تنہائی کے اوقات میں اپنی قوم کے غریب طبقے کے مسائل پر غور و فکر کیا کرتے تھے یا آپؐ معاشی عدم مساوات کو اپنی قوم کا بنیادی مسئلہ سمجھتے تھے، محض مصنف کا ذاتی مفروضہ ہے جو مارکسی فکر کے اثرات کو ظاہر کرتا ہے۔

مشہور مصنف ڈبلیو منٹگمری واٹ جنہوں نے Muhammad at Mecca، Muhammadat Medina اور Muhammad Prophet and Statesman جیسی کتب لکھ کر بڑی شہرت حاصل کی ہے اور جن کے بارے میں عمومی تاثر یہ ہے کہ سیرت کے بارے میں ان کا قلم باقی مستشرقین کی نسبت کافی غیر جانبدار رہے، وہ بھی آپؐ کی زندگی اور تعلیمات کی تشریح میں عرب کے سماجی، معاشی، سیاسی اور ذہنی پس منظر کو یوں اجاگر کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اس بات کا قائل ہو جائے کہ حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات محض اس دور کے حالات کا نتیجہ تھیں۔ ایک مقام پر وہ لکھتے ہیں کہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اسلام کی یہ نئی تحریک کسی نہ کسی طور پر مکہ کے اُن حالات کا نتیجہ تھی جو محمد کے زمانے میں تھے۔ مناسب محرک کے بغیر کوئی نیا مذہب وجود میں نہیں آسکتا ...مکہ میں جو مشکلات ان کے زمانے میں تھیں، ان کے بارے میں فکر و پریشانی نے محمد کو خلوت نشینی پر آمادہ کیا۔6

حالانکہ سیرت کی کتب سے کسی طرح بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اپنی قوم کے مسائل نے آپ ﷺ کو خلوت نشینی پر اکسایا۔ سیرت ابن ہشام میں واضح طور پر لکھا ہے کہ قریش میں یہ طرزِ عبادت معروف تھا کہ جس میں ایک شخص مکمل توجہ اور یکسوئی سے عبادت کرنے کے لئے اعتکاف کرتا۔ 7 لہذا منٹگمری

واٹ کا یہ تجزیہ تاریخی حقائق کے مقابلہ کسی طرح قبول نہیں کیا جا سکتا۔ رسول اللہ ﷺ کی نبوت و بعثت کے پس منظر میں معاشی مسائل کو مبالغے کے ساتھ پیش کرنے والوں میں منٹگمری واٹ تنہا نہیں ہیں۔ کم و بیش تمام ایسے تمام مستشرقین جنہوں نے آپ ﷺ کو براہِ   راست جھوٹا مدعی نبوت (Imposter)، یا مرگی کا مریض قرار نہیں دیا، انہوں نے آپ ﷺ کی زبردست اصلاحی تحریک کو مادی عوامل سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر سویڈش مستشرق طور اینڈرے لکھتے ہیں کہ یہ بات اغلب ہے کہ مکہ جیسے شہر میں جہاں آ   بادی کا بنیادی دارومدار تجارت پر تھا، مشکل حالات میں غربت شدید تر ہو جاتی ہو گی، اور یہ بات محض ایک گمان سے بڑھ کر ہے کہ قدیم ترین عرب تصورات کے مطابق سماجی فرض کا دائرہ کار محض ایک قبیلہ کے اپنے ارکان تک محدود تھا۔ لہٰذا اس بات کے لئے ٹھوس اسباب موجود تھے کہ محمد رحمدلی کے فریضہ کو گلے لگاتے۔8

ایسے بیانات سے بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ عرب معاشرے میں غربت یا دولت کا ارتکاز ہی سب سے اہم مسئلہ تھا۔ جبکہ قرآن اور کتب احادیث و سیرت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عرب معاشرہ اس وقت بت پرستی، خونریزی، قبائلی عصبیت اور اخلاقی بے راہ روی جیسے کئی امراض میں مبتلا تھا۔ اان کی کئی ایسی برائیوں کا ذکر خود قرآن میں ملتا ہے۔ مثلاً سورۃ انعام کی اس آیت میں عرب کے جاہلی معاشرے پر یوں تبصرہ کیا گیا ہے:

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ   سَفَهًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ   اللّٰهُ افْتِرَاۗءً عَلَى اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ 9

(جن لوگوں نے اپنی اولاد کو بے وقوفی سے بے سمجھی سے قتل کیا اور خدا پر افتراء کر کے اس کی عطا فرمائی ہوئی روزی کو حرام ٹھہرایا گیا وہ گھاٹے میں پڑ گئے۔ وہ بے شبہ گمراہ ہیں اور ہدایت یافتہ نہیں ہیں۔)

شرک اور قتل اولاد جیسے جرائم جس قوم میں عام تھے اس کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کا سب سے بڑا مسئلہ صرف دولت کی غیر منصفانہ تقسیم تھی، محض علمی بددیانتی ہی کہلا سکتی ہے۔ عمرو بن لحی کے جزیرۃ العرب میں بت پرستی کو متعارف کرانے کے بعد شرک آہستہ آہستہ عرب معاشرے میں پوری طرح سرایت کر گیا۔ عمرو بن لحی نے مال مویشی کی خاطر بدعات اور شرکیہ رسوم ایجاد کیں جن کی اس کی قوم نے اندھادھند تقلید کی اور ملت ابراہیمی جس کی اساس توحید و وحدانیت تھی اسے یکسر بدل ڈالا۔ شعائر حج اور دیگر دینی امور کو تہ و بالا کر ڈالا اور سابقہ اقوام کی مشرکانہ رسوم کو اختیار کر لیا۔ 10 شرکیہ رسوم

کے علاوہ شراب نوشی، جوا، جسم فروشی، رہزنی، قتل اور سود خوری جیسے رذائل عرب معاشرے کا یوں حصہ بن چکے تھے کہ انہیں کوئی قابل اعتراض فعل گرداناہی نہیں جاتا تھا۔ لہٰذا کسی طور پر یہ کہنا درست نہیں کہ عرب معاشرے کا بنیادی ناسور محض معاشی ناہمواریاں تھیں۔ تاہم ان تمام تاریخی حقائق کے برعکس مستشرقین کی اکثریت آپ ؐکی تعلیمات کو عرب معاشرے کے مادی احوال سے جوڑتی ہی نظر آتی ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر اور مشہور مستشرق ایچ۔ اے۔ آر۔ گب ایک مقام پر لکھتے ہیں:

ایک طرف تو محمدؐ نے ہر تخلیقی شخصیت کی طرح بیرونی حالات کی پابندیوں کو سہا اور دوسری طرف اپنے عہد اور حالات کے تصورات اور روایات کے ذریعہ ایک نیا راستہ کھولا۔ ایک غیر معمولی شخصیت اور اس شخصیت کے عہد کے بیچ تعلق کا مطالعہ اور وضاحت تاریخی تحقیق کا موضوع ہے۔ 11

گویا پروفیسر گب کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات محض وقتی حالات کا ردعمل تھیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تعلیمات اگر رائج افکار ہی کا نتیجہ تھیں تو شرک و بت پرستی سے آلودہ اس ماحول میں توحید خالص کا تصور کیسے پیدا ہو گیا۔ ایک شخص اگر تاریخ کے متفقہ بیانات سے بھی اختلاف کرنے کا شوق رکھتا ہو تو ظاہر ہے کہ اپنے ذاتی خیالات اور رجحانات سے آزاد ہو کر علمی بحث و تحقیق کا انداز نہیں اپنا سکتا۔ معروف مستشرق منٹگمری واٹ جزیرۃ العرب میں امراء کے غلبہ و اہمیت اور غرباء کی پسماندگی کا ذکر کرتے ہوئے یہاں تک بڑھ جاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بھی یہ کہنے سے گریز نہیں کرتے ہیں کہ ایک موقع پر حضرت عبد اللہ ابن مکتوم رضی اللہ عنہ کی بجائے قریشی سرداروں کی طرف آپؐ کے متوجہ ہونے کا سبب بھی یہی تھا کہ آپؐ کے نزدیک ان سرداروں کے مقابلہ میں کمزور طبقہ کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

منٹگمری واٹ کے بقول قرآن میں یتیموں کے معاملہ کی طرف جو اشارہ کیا گیا ہے اس سے یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ یہ یتامی اپنے ہی رشتہ داروں کی بدسلوکی کا شکار تھے جو ان کے سرپرست بنے ہوئے تھے۔ سورۃ عبس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد بھی ایک لمحہ کے لئے گمراہ ہوئے اور اس جاری و ساری اصول پر عمل کیا کہ صرف امیر اور بااثر طبقہ ہی اہمیت رکھتا ہے اور ان کے علاوہ دیگر طبقات کی کوئی اہمیت نہیں۔12

ایک طرف یہ تاثر دینا کہ آپ ؐکی تعلیمات کا مقصد غریب طبقہ کو اس کا حق دلانا تھا اور دوسری طرف یہ کہنا کہ آپ کے نزدیک امراء کے مقابلے میں غرباء کی کوئی اہمیت نہ تھی بذات خود ایک متناقض بات

ہے۔ جہاں تک اس واقعہ کا تعلق ہے جس کا منٹگمری واٹ حوالہ دے رہے ہیں، تو اس کی تفصیل علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں کچھ یوں بیان کی ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ قریش کے کسی بڑے (سردار) سے گفتگو کر رہے تھے اور ان کے قبول اسلام کی خواہش رکھتے تھے۔ اس دوران اچانک حضرت عبد اللہ ابن مکتوم رضی اللہ عنہ آ گئے۔ اور وہ اولین اسلام لانے والوں میں سے تھے۔ پس وہ آپؐ سے بار بار سوال کرنے لگے۔ آپؐ نے چاہا کہ عبد اللہ ابن مکتوم کچھ دیر کے لئے خاموش ہو جائیں تا کہ آپؐ اطمینان سے اُس آدمی سے بات کر سکیں کیونکہ آپؐ اس شخص کی ہدایت کی خواہش و رغبت رکھتے تھے۔ پس آپؐ عبد اللہ بن مکتومؓ کے سامنے چیں بہ جبیں ہوئے اور ان سے منہ پھیر کر دوسرے شخص کی طرف کر لیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: (محمد مصطفیٰؐ ترش رو ہوئے اور منہ پھیر بیٹھے کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا؛ اور تم کو کیا خبر شاید وہ پاکیزگی حاصل کرتا۔)13

ابن کثیر کے بیان سے واضح ہو رہا ہے کہ آپ ﷺ کا حضرت عبد اللہ ابن مکتومؓ سے اعراض اُن کے غریب ہونے کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ایک غیر مسلم سے مخاطب تھے جس کی ہدایت کے آپؐ بہت خواہشمند تھے۔ حضرت عبد اللہ ابن مکتومؓ کی جگہ اگر حضرت ابو بکر صدیقؓ بھی ہوتے تو اس موقع پر ان کی بار بار مداخلت پر شاید آپؐ کا یہی ردعمل ہوتا۔ دوسری طرف یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت عبد اللہ ابن مکتومؓ نابینا تھے اور اس وجہ سے وہ آپؐ کی مصروفیت کا صحیح طرح ادراک نہ کر سکنے کے باعث بہت اصرار سے سوال کر رہے تھے جس کی وجہ سے آپؐ کی پہلے سے جاری گفتگو میں خلل پڑا۔ جاری گفتگو میں مداخلت عمومی طور پر بھی غیر مناسب سمجھی جاتی ہے۔ لہذا یہ ایک طبعی امر تھا، تاہم ایک رسول کا مرتبہ چونکہ عام آدمی سے بلند ہوتا ہے اسلئے اس معمولی بات پر بھی وحی میں سرزنش کی گئی۔

مستشرقین میں سے بعض نے یہ ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے قریبی رفقاء بھی در حقیقت اس دنیوی فائدے کی وجہ سے آپؐ سے وابستہ ہوئے تھے جو انہیں اسلام کی مساوات پر مبنی تعلیمات کی صورت میں دکھائی دے رہا تھا۔ مارگولیتھ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ ان کا تعلق ایک ادنیٰ قبیلے سے تھا، لہذا اسلام جس مساوات کا وعدہ کر رہا تھا، اس میں ان کے لئے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور تھا۔ سالوں بعد جب وہ خلیفہ بنے (تو ایک موقع پر) انہوں نے طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے ابو سفیان کی تذلیل کرنے میں راحت محسوس کی اور خدا کا شکر ادا کیا

کہ اسلام کے ذریعے ان کے ادنی قبیلے کے ایک رکن کو یہ اختیار ملا کہ وہ عبد مناف جیسے معزز قبیلے کے رکن کو حکم دے سکتا تھا۔14

اگر یہ مان لیا جائے کہ حضرت عمرؓ نے اسی قوت واختیار کو حاصل کرنے کے لئے اسلام قبول کیا تو پھر ایسے اصحاب (مثلاً حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عثمان غنیؓ) کے قبول اسلام کی کیا وجہ تھی جو قبول اسلام سے پہلے ہی معاشرے میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام رکھتے تھے؟ نیز یہ کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی اس قوت واختیار سے ایسا کوئی فائدہ کیوں نہیں اٹھایا؟ یہاں تک کہ خود پر ہونے والے قاتلانہ حملہ کے بعد انہوں نے جن اصحاب کو خلافت کے لئے نامزد کیا، ان میں بھی اپنے کسی عزیز (حضرت سعید بن زیدؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ) کو نامزد کیوں نہیں کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ تاریخی حقائق مستشرقین کے ان نظریات و تعبیرات کی بالکل تائید نہیں کرتے۔ مادی فوائد کا حصول تو دور متبعین اسلام کو تو اپنے ایمان کی قیمت میں وہ سب کچھ بھی قربان کرنا پڑا جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھا، یہاں تک کہ ہجرت کی صورت میں اپنا گھر بار، اہل وعیال اور غزوات وسرایا کے دوران اپنی جانیں بھی۔ ایسے جانثاروں کے بارے میں یہ کہنا کہ ان کی اسلام سے وابستگی کے پیچھے مادی لالچ تھا، علمی بد دیانتی ہی کہلا سکتا ہے۔

نبوت کے روحانی سرچشمہ کا انکار

کسی بھی میدان میں تحقیق غیر جانبداری کا تقاضا کرتی ہے۔ متعصب ذہن کے ساتھ جو بھی علمی بحث کی جائے گی اس کا نتیجہ پہلے سے موجود تعصبات کی تقویت کی صورت میں ہی نکلے گا۔ سیرت پر قلم اٹھانا بھی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ محقق خواہ آپؐ پر ایمان رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، بہر حال اس سوچ کو لے کر تحقیق نہ کرے کہ آپؐ پیغمبر ہو ہی نہیں سکتے۔ لازم ہے کہ وہ آپؐ کی رسالت کو ایک ممکنہ امر خیال کرتے ہوئے تحقیق کرے۔ دوسری صورت میں اس کی تحقیق آپؐ کی رسالت کے خلاف ایک متعصبانہ علمی کاوش کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھی جائے گی۔ اس حوالے سے جب مستشرقین کی تحریروں کا جائزہ لیا جائے تو بظاہر غیر جانبدارانہ شہرت رکھنے والے مستشرقین بھی اس تعصب سے خالی نظر نہیں آتے۔ رسالت کے روحانی سرچشمہ کا امکان کسی کے مد نظر نہیں۔ ان کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سچے ہوں، مخلص ہوں، اپنی قوم کے خیر خواہ مگر اُن کی تعلیمات کا ذریعہ وحی ہو، یہ ہرگز ممکن نہیں۔

They disregard all authentic Hadiths and revelations which prove that the Prophet (PBUH) had a sudden revelation from the Almighty at a precise moment of his life.They then allege that the Holy Quranic Verses which mention the Revelation of the Quran on "the Night of Power" in Ramadan are ambiguous, for they do not contain any clear reference to the beginning of Revelation.15

(وہ ایسی تمام مستند احادیث اور آیات کو تسلیم نہیں کرتے جن سے نبی ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کی زندگی کے کسی خاص لمحے میں اچانک وحی نازل ہونا ثابت ہوتا ہو۔ وہ یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ قرآن کریم کی وہ آیات جن میں قرآن کے ماہِ رمضان میں لیلۃ القدر میں نازل ہونے کا ذکر ہے، مبہم ہیں۔ کیونکہ ان آیات سے نزول وحی کے آغاز کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں ملتا۔)

ٹامس کارلائل جن کے بارے میں یہ تصور عام ہے کہ ان کے قلم نے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کافی غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا ہے، وہ آپؐ کے کلام کو فطرت کی ایک سچی آواز سے بڑھ کر کوئی تعبیر دینے کو تیار نہیں۔ 16 دور جدید کی معروف برطانوی مستشرق کیرن آرم سٹرانگ جن کی سیرت پر کتاب کا عنوان Muhammad Prophet for our Time بظاہر یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ حضرت محمد ﷺ کو ایک Prophet (پیغمبر) کا مقام دینے پر تیار ہیں، قرآن کو آپؐ کا ذاتی کلام ہی سمجھتی ہیں۔ ایک مقام پر وہ لکھتی ہیں:

Muhammad sometimes had to struggle to maintain his composure. One of the early surahs expresses his rage against his uncle Abu Lahab and his wife, who used to scatter sharp horns outside his 17house.

(بعض اوقات محمد کو خود کو پر سکون رکھنے کے لئے انتہائی کوشش کرنا پڑتی۔ اولین سورتوں میں سے ایک اُن کے چچا ابو لہب اور اُس کی بیوی کے خلاف اُن کے غصے کا اظہار ہے جو آپؐ کے گھر کے باہر تیز کانٹے بکھیرا کرتی تھی۔)

مستشرقین کے ان خیالات سے عیاں ہے کہ وہ وحی اور نبوت کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ وحی اور نبوت کے تعلق کو سمجھے بغیر ایک شخص اگر اپنے نظریات اور تجرباتی علوم کی روشنی میں ان دونوں کو جانچنے کی کوشش کرے تو اُس کا اِن کی حقیقت سے واقف ہونا ممکن نہیں۔ آسمانی وحی پر ایمان لانے والوں اور اسے تسلیم نہ کرنے والوں کے درمیان اختلاف کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ دونوں کے نزدیک وحی کا الگ مفہوم ہے۔ مذاہب کا تقابلی مطالعہ کرنے والے جدید و قدیم علماء اور فلاسفہ نے بحث و تحقیق کے بعد وحی کے وجود کو تسلیم کیا ہے اور شرعی مفہوم کے مطابق وحی کے امکان پر دلائل پیش کئے ہیں، انہوں نے ان شبہات اور دعوؤں کی بھی تردید کی ہے جو منکرین پیش کرتے ہیں، اب تحقیقی طور پر یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ وحی ایک مقدس شے ہے جس میں باطل کی آمیزش نہیں ہو سکتی۔ وحی الہی کا نفسیاتی تجزیہ پیش کرتے ہوئے یہ سمجھنا کہ اس کی آمد کے وقت نبی جسمانی بشریت سے جدا ہو کر روحانی پیکر میں سمو جاتے تھے اور ایک مخصوص کیفیت سے دوچار ہوتے تھے جو ایک طرح کا جنون یا مرگی ہوتا تھا، بلاشبہ خود تصور نبوت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔

سیرت کو عقلیت پسندانہ تناظر میں دیکھنا

نبوت کے روحانی سرچشمہ کا انکار کرنے والے مستشرقین چونکہ آپؐ کے دعویٰ نبوت کو براہِ راست جھوٹ بھی نہ کہہ سکتے تھے (کیونکہ اس صورت میں ان کا قلبی تعصب عیاں ہو جاتا اور وہ بہت سے غیر متعصب قارئین کی توجہ سے محروم ہو جاتے)، لہٰذا آپؐ کے کردار اور تعلیمات کی عقلی تاویل کرنا ان کے لئے لازم ہو گیا۔ عصر حاضر کے نمایاں مستشرق John L. Esposito جو اسلام کے بارے میں نسبتاً نرم خیالات کی وجہ سے جانے جاتے ہیں، ایک مقام پر آپؐ کے تجارتی سفروں اور تعلیمات کے درمیان یوں تعلق جوڑتے نظر آتے ہیں:

While the Muslim sees but one divine source for the Quran, the nonbeliever will search out human sources and explanations. This is particularly true where parallels exist between Quranic and biblical stories. Christian and Jewish communities did exist in Arabia. Moreover, Muhammad's travels as a caravan trader brought him into contact with other people of the Book. He would have known and been aware of these forms of monotheism.18

(جہاں مسلمان قرآن کا صرف ایک الٰہی ماخذ تسلیم کرتے ہیں، وہاں ایک غیر مسلم اس کے انسانی ذرائع اور تاویلات ڈھونڈنے کی کوشش کرے گا۔ یہ بات خصوصاً (قرآن) کے ان مقامات کے لئے درست

ہے جہاں قرآن اور بائبل میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ عرب میں عیسائی اور یہودی واقعتاً آباد تھے۔ مزید براں محمد کے بطور تاجر قافومس کے ساتھ سفر انہیں دیگر اہل کتاب کے قریب لائے۔ انہیں (اہل کتاب کے ذریعے) توحید کی ان صورتوں کا علم ہوا ہو گا اور وہ ان سے واقف ہوں گے۔)

مستشرقین ایک طرف تو بعض مشترکہ نکات کی بنیاد پر آپؐ کی تعلیمات کو تورات اور انجیل سے ماخوذ قرار دیتے ہیں، دوسری طرف آپؐ کی دعوت اور کردار کی نفسیاتی تشریح کرکے اس کی عقلی تعبیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی ذہانت، عبقریت، فہم و فراست کی بنا پر یہ ثابت کرتے ہیں کہ قرآن اس ماحول کے اثر سے آپؐ کے قلب و ذہن میں ڈھلا جس میں آپؐ کی نشو و نما ہوئی تھی اور جس میں آپ نے زندگی بسر کی تھی یا پھر وہ باطنی عقل کے فیضان کا نتیجہ ہے۔ مستشرقین اور مسلمانوں میں سے متعدد محققین نے علمِ تاریخ کی روشنی میں اس نقطۂ نظر کی تردید کی ہے۔ انہوں نے انسانی نفسیات کے مطالعہ اور آدمی کی صحت و مرض کا تجزیہ کرکے بتایا ہے کہ اعصابی بیماریوں میں مبتلا اشخاص سے عظمت و برتری کے کمالات، قابل رشک کارناموں اور غیر معمولی ذہنی نتائج کا ظہور ناممکن ہے نیز وحی کے حالات و کیفیات اعصابی امراض (مرگی اور بیہوشی وغیرہ) کی کیفیات سے بالکل مختلف ہیں۔ مصری مصنف محمد حسین ہیکل لکھتے ہیں کہ وحی کی کیفیات کو مرگی سے تعبیر کرنا ایک زبردست علمی غلطی ہے۔ اس مرض میں تو مریض کے ذہن میں اگر کچھ آتا بھی ہے تو وہ ہوش میں آتے ہی اسے بھلا بیٹھتا ہے۔ اس مرض کے حملہ کے دوران مریض کی زبان پر کوئی بات بھی نہیں آتی کیونکہ اس حالت میں اس کا شعور و فکر بالکل معطل ہو چکا ہوتا ہے۔ لہٰذا مرگی کے مرض اور وحی کے درمیان کوئی بھی مشابہت نہیں پائی جاتی۔ علاوہ ازیں وحی کے نزول کے دوران آپؐ کی قوت مدرکہ جس طرح بیدار رہتی وہ اس مرض کے حملہ کے وقت ممکن ہی نہیں۔ نزول وحی صرف غنودگی کے عالم میں نہیں ہوا بلکہ عین بیداری میں بھی وحی کا نزول ہوا جیسا کہ سورۃ فتح صلح حدیبیہ کے بعد اس وقت نازل ہوئی جب آپ صحابہ کے ساتھ مدینہ کی طرف لوٹ رہے تھے۔19

قرآن کو آپؐ کا کلام ثابت کرنے کے پیچھے مستشرقین کا مقصد قرآن کا مقام گھٹانا ہے کیونکہ اگر یہ ثابت ہو گیا کہ وہ محمد کا کلام ہے تو لامحالہ یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ وہ انسانی فکر و عمل کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد اس کی ساری عظمت اور معنوی بلندی خاک میں مل جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں نظم و نسق اور گوناگوں پہلوؤں سے نہایت واضح اور بیّن فرق ہے۔ علاوہ ازیں آپؐ اُمی تھے۔ وہ پڑھنا لکھنا

نہیں جانتے تھے اور محض یہ دلیل ہی اس بات کو رد کرنے کے لئے کافی ہے کہ قرآن آپ کا ذاتی کلام ہے۔ لہٰذا بعض مستشرقین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ محمد اُمی نہیں تھے بلکہ انہوں نے عام لوگوں سے بھی زیادہ حصولِ علم کیا تھا۔ مستشرق آر۔ وی۔ سی۔ بوڈلے بیان کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بحیرا کی صحبت میں رہ کر ایک عرصے تک اس سے استفادہ کرتے رہے، یہ راہب جب اس کم سن عربی سے گفتگو کرتا تو اسے معلوم ہوتا کہ وہ اپنے کسی رفیق سے گفتگو کر رہا ہے، چنانچہ اسی نے انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بتوں کی پرستش کے حماقت ہونے سے آگاہ کیا اور محمد ﷺ اس کی باتوں کو نہایت توجہ سے سنتے تھے۔20 بحیرا کے مشہور واقعہ کا دارومدار جس روایت پر ہے، وہ سنداً ضعیف ہے اور قابل استناد نہیں ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے اس پر مفصل نقد و جرح کی ہے۔ فرماتے ہیں:

تعجب ہے کہ اس روایت سے جس قدر عام مسلمانوں کو شغف ہے اس سے زیادہ عیسائیوں کو ہے، سر ولیم میور، ڈریپر، ماگولوس وغیرہ سب اس واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہ نے مذہب کے حقائق واسرار اسی مذہب سے سیکھے اور جو نکتے اس نے بتادیئے تھے، انہی پر آنحضرتؐ نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی، اسلام کے تمام عمدہ اصول انہی نکتوں کے شروح اور حواشی ہیں۔ عیسائی مصنفین اگر اس روایت کو صحیح مانتے ہیں تو اس طرح ماننا چاہئے جس طرح روایت میں مذکور ہے۔ اس میں بحیرا کی تعلیمات کا کہیں ذکر نہیں، قیاس میں نہیں آسکتا کہ دس بارہ برس کے بچے کو مذہب کے تمام دقائق سکھادیئے جائیں اور اگر یہ کوئی خرق عادت تھا تو بحیرا کے تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت ناقابل اعتبار ہے۔21

رسول اللہ کی شخصیت و تعلیمات کی عقلی تشریح کرنے کے ساتھ ساتھ مستشرقین آپؐ کی دعوت کی قبولیت اور کامیابی کی بھی مادی تاویل کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کامیابی کے اسباب بھی روحانی و اخلاقی نہیں بلکہ سیاسی اور معاشی تھے۔ ایچ۔ اے۔ آر۔ گب لکھتے ہیں کہ انسانی حوالے سے بات کی جائے تو (کہا جاسکتا ہے کہ) محمد اس لئے کامیاب ہوئے کیونکہ وہ مکہ سے تعلق رکھتے تھے۔22

واقعات سیرت کی عقلی تعبیر کرنے والوں میں غیر مسلم مصنفین کے ساتھ مسلم مصنفین بھی شامل ہیں۔ سر سید احمد خان جنہوں نے ولیم میور کی کتاب کے رد میں خطبات احمدیہ لکھ کر بلاشبہ ایک عظیم خدمت سرانجام دی، خود کسی نہ کسی حد تک مغربی افکار سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اسی کتاب میں انہوں

نے چاہِ زمزم، اصحابِ فیل، شقِ صدر اور معراج جیسے واقعات کی عقلی تعبیر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ چاہِ زمزم کے معجزاتی پہلو کا انکار کرتے ہوئے وہ یہ تاویل پیش کرتے ہیں:

خانہ بدوش عرب پانی کے چشمہ کو جو اُن کو جنگل میں ملتا تھا جھانکڑ وغیرہ ڈال کر مٹی سے چھپا دیتے تھے تا کہ ان کے سوا اور کسی کو اس کا پتہ نہ ملے اور یہ رسم پانی کے کمیاب ہونے سے اُن میں جاری تھی اور اب تک جاری ہے۔ یہ بات نہایت قرین قیاس ہے کہ اسی طرح عربوں نے اس چشمہ کو جو اُس مقام پر تھا جہاں اب چاہِ زمزم واقع ہے چھپا دیا ہو گا۔ کیونکہ لفظ "بیر" عربی میں چشمہ آب کے معنی میں بھی آیا ہے۔ ان تمام حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس وقت حضرت ہاجرہ مضطربانہ ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں تو ان کو وہ چشمہ مل گیا۔23

سیرت کے لئے مخصوص مصادر کا استعمال

مصادر سیرت سے استفادے کے حوالے سے مستشرقین کے رویئے کو دو بنیادی نکات میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

مستشرقین قرآن کریم کو رسول اکرم ﷺ کی زندگی کا واحد قابل قبول ماخذ تصور کرتے ہیں۔

اکثر مستشرقین کی رائے یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے بارے میں مسلمانوں نے جتنی اہم کتب لکھیں وہ سب تیسری اور چوتھی صدی ہجری سے تعلق رکھتی ہیں۔

جہاں تک قرآن کریم کے بارے میں مستشرقین کے طرزِ عمل کا تعلق ہے تو وہ صرف اس حد تک درست ہے کہ آپؐ کی شخصیت اور زندگی کے بارے میں قرآن میں جو بھی معلومات ملتی ہیں انہیں باقی تمام کتب پر ترجیح حاصل ہے۔ تاہم یہ سمجھنا کہ صرف قرآن ہی ہمارے لئے سیرت طیبہ کو سمجھنے کا واحد ماخذ ہے، اس لئے درست نہیں کہ قرآن کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے جو ایک ایک تاریخی واقعے کو تفصیل سے بیان کرے جیسا کہ مستشرقین توقع رکھتے ہیں۔ تاہم مستشرقین کی اکثریت مطالعۂ سیرت میں قرآن کو ایک تاریخی کتاب کے طور پر استعمال کرتی ہے جسے نہ صرف آپؐ کی زندگی کے واقعات تفصیل سے بیان کرنے چاہئیں بلکہ آپؐ کی شخصیت اور آپؐ کی زندگی کے تمام ذہنی، روحانی اور سیاسی مراحل پر بھی روشنی ڈالنی چاہئے۔ لہٰذا سیرت کے وہ تمام واقعات جن کا قرآن میں کوئی ذکر نہیں ان کے نزدیک خود بخود قابل رد ٹھہرتے ہیں۔

تاہم یہاں ایک اہم سوال اٹھتا ہے کہ مستشرقین قرآن کو رسول اکرم ﷺ کی سوانح حیات کے طور پر کیوں دیکھتے ہیں؟ اس کی وجہ واضح ہے کہ ہر وہ شخص جو قرآن کو کلامِ الٰہی تسلیم نہیں کرتا وہ اسے حضرت محمد ﷺ کا ذاتی کلام سمجھتا ہے اور ظاہر ہے کہ کسی شخص کے کلام کو اسی کی ذہنی و جذباتی کیفیات کا آئینہ دار سمجھا جاتا ہے۔ اس ذہنی سانچے کے ساتھ جب وہ قرآن پڑھتے ہیں تو یہی توقع رکھتے ہیں کہ اس سے آپؐ کی زندگی کے ہر اہم پہلو پر روشنی پڑنی چاہیئے۔

مطالعۂ سیرت میں صرف قرآن پر انحصار کا دوسرا لازمی نتیجہ قرآن پر تنقید کی صورت میں نکلتا ہے۔ منٹگمری واٹ لکھتے ہیں کہ کسی وقت میں میں قرآن کو مکی دور کو سمجھنے کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ قرآن اس مدت کے لئے معاصر ضرور ہے مگر جانبدارانہ حیثیت سے۔ اس کے مختلف اجزاء کے درمیان ایک تو زمانی تسلسل قائم رکھنا دشوار ہے، اور اس کوشش سے جو نتائج برآمد ہوں گے، ان کے ارد گرد شک منڈلاتا ہو گا۔ لہٰذا قرآن مکی دور میں محمد (ﷺ) یا مسلمانوں کی زندگی کا مکمل خاکہ پیش کرنے میں ہمارے لئے کسی طرح بھی معاون نہیں ہے۔24

قرآن مجید کو جانبدار قرار دے کر مستشرق اس پابندی سے بھی آزاد ہونا چاہتے ہیں کہ سیرتِ طیبہ پر کلام کرنے کے لئے وہ کسی بھی اصلی ماخذ کے پابند ہوں۔ منٹگمری واٹ نے قرآن مجید پر جانبداری اور مشکوک نتائج کا الزام تو عائد کر دیا مگر اس بارے میں کوئی دلیل نہیں دی۔ اس کی کتاب اول سے آخر تک ایسی کسی مثال یا دلیل سے خالی ہے۔ قرآن مجید اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ اگرچہ اس عقیدے میں مستشرقین کو مسلمانوں کے ساتھ شرکت کا پابند نہیں کیا جا سکتا لیکن قرآن کی معنوی اور کلامی خوبیوں کا تو اِس کے بدترین دشمنوں، کفار مکہ نے بھی اعتراف کیا تھا۔ قرآن اپنی اعجاز بیانی میں بے مثل ہے۔ عہد نامہ قدیم و جدید جس کے مجموعہ کو بائبل کہا جاتا ہے، وہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے زمانوں کے بعد مختلف موقعوں پر مرتب ہوا ہے۔ قرآن مجید کا یہ مقصد نہیں تھا کہ وہ لمحہ بہ لمحہ تاریخی تفصیلات اور روزانہ کے واقعات کو ایک تاریخی کتاب کی طرح تفصیل سے بیان کرے، لیکن اس کے باوجود کئی محققین نے قرآن مجید سے مکی اور مدنی دور کے بارے میں قابل قدر اور تاریخی حقائق مستنبط کئے ہیں۔ قرآن مجید ایک جامع کتاب ہدایت ہے جس کا بنیادی مقصد عقیدے کی اصلاح ہے۔ اگر قرآن میں کہیں تاریخی واقعات کا تذکرہ ملتا بھی ہے تو اس کا مقصد یہ نہیں کہ کسی زمانے کے حالات و واقعات کے متعلق معلومات دے دی جائیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قاری ان واقعات کی روشنی

میں اپنے طرز عمل کی اصلاح کر سکے۔ گویا تاریخی واقعے کے بیان سے بھی قرآن کا مقصد فرد یا جماعت کی اصلاح ہوتا ہے۔ واقعات سے قرآن مجید کے استدلال کا یہ طریقہ ملت اسلامیہ کو زیادہ متحرک وفعال زندگی کی طرف راغب کرتا ہے۔ اس طرح محض مجرد نظریات کی بجائے زندگی سے مثالیں پیش کر کے قرآن اپنے مخاطب کے دل و دماغ پر گہرا اثر مرتب کرتا ہے۔

مصادر سیرت کے حوالے سے مستشرقین کے رویئے کا دوسرا اہم پہلو ان کی طرف سے کتب سیرت کی تخفیف کی کوشش ہے۔ اس سلسلے میں ان کا بنیادی اعتراض یہ ہے کہ یہ کتب تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں لکھی گئی ہیں، لہٰذا اِن میں ہر طرح کے من گھڑت اور غیر مستند واقعات بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔ کتبِ سیرت میں دی گئی معلومات کو مشکوک قرار دے دینے کے بعد یہ آسان ہو جاتا ہے کہ جس واقعے کو چاہیں قبول کر لیں اور جس واقعہ کو چاہیں اپنی خود ساختہ دلیلوں کی بنا پر رد کر دیں۔ مثال کے طور پر کئی مستشرقین جیسا کہ تورانیڈرے آپؐ کی زندگی کے اولین دور کی معلومات کو افسانوی قرار دیتے ہیں، کیونکہ اس دور میں دعوت و تبلیغ کیلئے آپؐ کی مساعی کو مدنی دور کی طرح وہ اقتدار کے لالچ سے منسوب نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا سب سے مناسب طریقہ یہی تھا کہ اس دور کی تمام روایات کو من گھڑت قرار دے دیا جائے۔

What is related of his earlier experiences is mainly legendary.25

(ان کے ابتدائی تجربات کے بارے میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے، بنیادی طور پر وہ محض افسانوی ہے۔)

کسی بھی تاریخی واقعہ کو افسانوی یا من گھڑت قرار دینے کیلئے ضروری ہے کہ اس کے مقابلہ میں تاریخی دلائل پیش کر کے ہی اسے رد کیا جائے۔ محض اندازوں اور تخمینوں کی بنا پر تاریخی روایات کو رد کرنا تحقیقی اصولوں کی نفی ہے۔ آپؐ کی حیات مبارکہ کے ابتدائی حالات میں بعض امور یقینا مختلف فیہ ہیں، تاہم ان چند امور کی بنا پر یہ کہہ دینا کہ تمام ابتدائی تفصیلات من گھڑت ہیں، ایک غیر ذمہ دارانہ بیان ہے۔

منہج اثر و تاثیر

مطالعہ سیرت میں مستشرقین کا ایک اور نمایاں منہج آپؐ کی تعلیمات کو یہودی یا نصرانی الاصل ثابت کرنے کے لئے مشترکہ نکات کو کو بطور دلیل پیش کرنا ہے۔ قرآن مجید میں اس امر کو واضح طور پر بیان کیا گیا کہ قرآن اسی سلسلۂ ہدایت کی کڑی ہے جس کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا۔ قرآن اور

سابقہ الہامی کتب کے درمیان مشابہ امور کی وجہ بھی یہی ہے کہ ان کا سرچشمہ ایک ہی ذاتِ بابرکت ہے۔ چونکہ پچھلی الہامی کتب انسانی دست برد سے محفوظ نہیں رہ سکیں اس لیے قرآن کو ان کیلئے مصدق و مھیمن کہا گیا ہے۔ تاہم انہی مشابہ امور کو مستشرقین نے اس بات کی بنیاد بنایا کہ قرآن کو تورات و انجیل سے ماخوذ قرار دے سکیں۔ یہودی مستشرقین مثلاً گولڈ زہیر، شاخت، برنارڈ لیوس، اسلام کے یہودیت سے ماخوذ و متاثر ہونے کا زور و شور سے دعویٰ کرتے ہیں۔ جہاں تک مسیحی مستشرقین کا تعلق ہے تو وہ بھی اس دعویٰ میں ان کی پیروی کرتے ہیں؛ اگرچہ عیسائیت میں کوئی باقاعدہ شریعت موجود نہیں جس کے بارے میں وہ گمان کر سکتے کہ اسلامی قانون اس سے متاثر و ماخوذ ہے تاہم اس میں اخلاقی اصول موجود ہیں جن کے متعلق مستشرقین کا یہ گمان ہے کہ وہ اسلام پر اثر انداز ہوئے، بلکہ عیسائیت سے ہی اسلام میں داخل ہوئے۔ ایسے دعووں کی بنیاد (درحقیقت) اسلام، یہودیت اور نصرانیت کے مابین پائے جانے والے مشترکہ نکات پر ہے۔

اکثر مستشرقین نے اسلام کو یہودی الاصل یا نصرانی الاصل قرار دینے کے لئے جو دلائل دیئے ہیں وہ محض ظن و گمان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ کہنا کہ آپؐ نے ورقہ بن نوفل سے تحصیلِ علم کیا ہو گا یا حبشہ سے تعلق رکھنے والے غلاموں کے ذریعے حبشہ میں رائج مذہب عیسائیت کے بارے میں معلومات حاصل کر لی ہوں گی۔ بحیرہ راہب سے حصولِ علم کے الزام کا ذکر بھی اوپر گزر چکا۔ علاوہ ازیں آپؐ کی ازواج میں سے حضرت صفیہؓ اور حضرت ماریہؓ کے بارے میں بھی یہ دعویٰ کیا گیا کہ انہوں نے آپؐ کو یہودیت اور عیسائیت کے بارے میں بیش قیمت معلومات دی ہوں گی۔ مشہور مستشرق فلپ کے ہٹی جو پرنسٹن یونیورسٹی (امریکہ) میں پروفیسر بھی رہے اور جنہیں بڑی حد تک امریکی استشراق کے رجحانات کے تعین کا ذمہ دار کہا جا سکتا ہے، اسلام کی اصلیت کا یوں ابطال کرتے ہیں:

قرآن کے ذرائع بلاشبہ عیسائی، یہودی اور عرب بت پرست ہیں۔ خود حجاز میں عیسائی نہ سہی مگر یہودی آبادیاں موجود تھیں، تاہم مسیحی غلام اور تاجر موجود تھے۔ حجاز کے ارد گرد ایسے مراکز بھی موجود تھے جہاں عیسائی عقائد کی روشنی ہو سکتی تھی۔ رسول (ﷺ) کے دو حبشی غلام بھی تھے، ان کے مؤذن، بلال اور ان کے مستقبل کے متبنیٰ، زید۔ ان کی ایک عیسائی بیوی ماریہؓ قبطیہ اور ایک یہودی بیوی صفیہؓ بھی تھیں جن کا تعلق مدینہ کے اس قبیلہ سے تھا جسے آپؐ نے تباہ کر دیا تھا ... کلیسا کے مسلمہ عقائد کے

برعکس اور ثانوی ذریعہ سے ماخوذ ہونے کی وجہ سے، قرآن غلط اور صحیح مذہبی معلومات میں فرق نہیں کرتا۔ 26

معروف مستشرق گولڈ زیہر کے خیال میں اسلام اگرچہ یہودیت، عیسائیت اور اہل عرب کے رسوم و رواج سے ہی ماخوذ ہے تاہم محمد ﷺ ان تمام افکار و نظریات سے کچھ اس طرح متاثر ہوئے کہ انہیں اخلاص کے ساتھ خود پر اترنے والی ایک وحی خیال کر لیا۔27

اگر اسلام کو یہودی یا نصرانی الاصل مان لیا جائے تو اس بات کا کیا جواز پیش کیا جائے گا کہ اسلام نے براہِ راست ان تصورات و عقائد کا رد کیا ہے جو یہودیت اور عیسائیت کی بنیاد ہیں؟ مثلاً ابنیتِ مسیح علیہ السلام، عقیدۂ کفارہ، حضرت سلیمان علیہ السلام سے کفر کا منسوب کیا جانا، عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ قرار دینا وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں جس توحیدِ خالص کا تصور پایا جاتا ہے وہ اس وقت دنیا کے کسی بھی کونے میں موجود نہیں تھا جس وقت رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے۔ اسلامی عقائد، عبادات، معاشرتی، معاشی، عائلی اور فوجداری قوانین میں جو جامعیت اور کاملیت پائی جاتی ہے اس کی کسی بھی مذہب میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ کسی شے کی نقل اصل کے مقابلے میں ہمیشہ کمزور اور بے وزن ہوتی ہے، پھر آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ یہودیت اور عیسائیت کا چربہ اُن سے کہیں زیادہ واضح، جامع اور مکمل ہو؟ محض چند مشابہ اُمور کی بنا پر ایک مذہب کو دوسرے مذہب کا چربہ قرار نہیں دیا جا سکتا جب تک کہ تاریخی بنیادوں پر یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ اس مذہب کا بانی ایک جھوٹا اور دھوکہ باز شخص تھا اور جہاں تک رسول اللہ ﷺ کا تعلق ہے تو آپؐ وہ شخصیت ہیں جن کی امانتداری اور سچائی کا آپؐ کے بدترین دشمن بھی چاہنے کے باوجود انکار نہیں کر سکے۔

تشکیکی انداز

سیرت کی مادی تعبیر کرنے والوں کے ہاں اکثر یہ منہج بھی نظر آتا ہے کہ تاریخی وقائع کے بارے میں مختلف آراء پیش کر کے شکوک و شبہات پیدا کیے جائیں۔ عام طور پر ایسے اعتراضات چند مفروضوں اور تاریخی شکوک کے اِرد گرد گردش کرتے ہیں، حالانکہ رسول اللہ ﷺ کی ولادت سے لے کر وفات تک کی پوری زندگی نہایت واضح اور روشن ہے۔ ان شبہات نے بعض تاریخی حقائق کو بھی افترا پردازی اور گمراہی میں مخلوط کر دیا ہے، اس بنا پر حقائق و غیر حقائق، تحلیل و اعتراض اور تاریخ و افسانہ میں حدِ

فاصل قائم کرنا اور امتیاز کرنا بعض اوقات بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں "محمد" کے عنوان کے تحت مضمون میں آپؐ کی زندگی کے ابتدائی احوال کو یوں مشکوک قرار دیا جاتا ہے:

The very first question a biographer has to ask, namely when the person was born, cannot be answered precisely for Muhammad. We have no certain chronological data for the Meccan period of his life. His activity in Medina covered approximately ten years, from the Hijra in 622 A.D. until his death in 632. Most of the sources say his activity as a prophet in Mecca also lasted ten years, but there is considerable difference of opinion on this question.28

(ایک سوانح حیات لکھنے والے کا پہلا بنیادی سوال کہ متعلقہ شخص کہاں پیدا ہوا، اس کا جواب بھی محمد (ﷺ) کے بارے میں صحیح طور پر نہیں دیا جا سکتا۔ ہمارے پاس ان کی زندگی کے مکی دور کا بھی کوئی یقینی تاریخی ریکارڈ نہیں ہے۔ سن 622ء میں ہجرت کے بعد مدینہ میں ان کی سرگرمیوں کا دور سن 632ء تک تقریباً دس سال کے عرصے کو محیط ہے۔ زیادہ تر ذرائع سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں بھی اُن کی سرگرمیاں دس سال تک جاری رہیں، تاہم اس بارے میں کافی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔)

یقینی تاریخی ریکارڈ (certain chronological data) کی شرائط مصنف نے واضح نہیں کیں۔ مستشرقین کے خود تردیدی رویئے کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ جہاں کہیں تاریخ میں انہیں ایسی کوئی ضعیف سی روایت بھی مل جائے جس سے وہ اپنے خود ساختہ نظریات کو صحیح ثابت کر سکیں، وہاں اس روایت کے "یقینی" اور درست ہونے کے لئے انہیں کوئی ٹھوس تاریخی روایت درکار نہیں ہوتی۔ مثلاً واقعہ غرانیق کے حوالے سے ضعیف روایات جنہیں اس طور پر مبالغہ آمیز انداز میں پیش کیا گیا کہ آپؐ کو ایک مصلحت پسند شخصیت کے طور پر پیش کیا جا سکے جو اپنے مقصد کی کامیابی کیلئے اپنے بنیادی نظریات سے انحراف کیلئے بھی تیار ہو۔ اس کے برعکس ایسے تمام امور جس سے آپ کی عظمتِ کردار کا ثبوت ملتا ہے یا بلند نبوی منصب پر روشنی پڑتی ہو، انہیں مشکوک بنا کر پیش کیا جاتا ہے، جیسا کہ کئی مستشرقین نے آپ کے معجزات کی نفی کی ہے۔ ڈی۔ ایس۔ مارگولیتھ لکھتے ہیں:

وہ معجزات جن کے نتیجے میں بیشمار لوگوں کو کھانا کھلایا جاتا یا تھوڑی سی شے لامحدود وقت تک ختم ہونے میں نہ آتی، محض بعد میں آنے والی نسلوں کے خوش کن خیالات ہیں جو ان (حضرت محمد ﷺ) سے وابستہ کر دیئے گئے: تاہم یہ بات بالکل واضح ہے کہ آپ نےؐ ایسی صلاحیتوں کا دعوی کیا اور نہ ہی لوگوں کو ایسا گمان کرنے دیا، باوجود اس کے کہ اگر ایسا کوئی دعوی کیا جاتا تو لوگ انہیں سراہتے۔29

یہ درست ہے کہ قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ایسے ارشادات ملتے ہیں جن میں آپؐ کو ایک عام انسان قرار دیا گیا ہے، مثلاً یہ فرمان الہی:

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ 30

(کہہ دو کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں (البتہ) میری طرف وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود (وہی) ایک معبود ہے۔)

تاہم اس طرح کے ارشادات کا مطلب یہ نہیں کہ آپؐ ہر لحاظ سے ایک عام آدمی جیسی صفات و مقام رکھتے تھے۔ بلکہ ایسی تمام آیات کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ پیغمبر بھی بشر ہوتے ہیں اور ان کے بلند مرتبے کا سبب اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہونے والی وحی ہوتی ہے۔ البتہ پیغمبروں کو عام انسانوں پر فضیلت حاصل ہوتی ہے، انہیں جس عصمتِ کردار اور بلند مرتبہ سے نوازا جاتا ہے، وہ عام انسانوں کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح انہیں معجزات بھی عطا کیے جاتے ہیں۔ فرمان الٰہی ہے:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ مِّنْهُم مَّن كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ 31

(پیغمبر (جو ہم وقتاً فوقتاً بھیجتے رہتے ہیں) ان میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ بعض ایسے ہیں جن سے خدا نے گفتگو فرمائی ہے اور بعض کے (دوسرے امور میں) مرتبے بلند کئے۔ اور عیسیٰ ابن مریمؑ کو ہم نے کھلی ہوئی نشانیاں عطا کیں اور روح القدس سے اُن کو مدد دی۔)

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں مستشرقین کا یہ کہنا کہ آپؐ سے کوئی معجزہ صادر ہوا، نہ ہی آپؐ نے کبھی ایسا کوئی دعویٰ کیا، تاریخی حقائق کی روشنی میں درست نہیں ہے۔ اگرچہ آپ کے سب سے بڑے معجزے قرآن کریم پر ہی طرح طرح کے اعتراضات کرکے اس کا انکار کر دیا جاتا ہے، تاہم اس کے علاوہ معجزات جن کا تاریخ میں ذکر ملتا ہے انہیں یا تو ذکر کے قابل نہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا پھر من گھڑت قرار دے کر رد کر دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر شقِ قمر کا واقعہ، ہجرت کی شب آپؐ کا کافروں کو دکھائی دیئے بغیر گھر سے نکل جانا، سراقہ بن جعشمؓ کا آپؐ کو نقصان پہنچانے سے عاجز رہنا، قبا کے کنوئیں سے متعلق معجزہ، مستقبل کے بارے میں آپؐ کی پیشین گوئیوں کا درست ہونا، آپؐ کا جانوروں کی زبان کو سمجھ لینا، بارش سے متعلق معجزات اور متعدد ایسے واقعات ہیں جو آپؐ معجزات پر دلالت کرتے ہیں۔ 32 درحقیقت یہاں مستشرقین کا اعتراض حضرت صالح علیہ السلام کی اُس قوم کی

طرح ہے جس نے اپنے پیغمبر سے معجزے کا مطالبہ کیا اور وہ مطالبہ پورا ہونے کے باوجود وہ نہ صرف ایمان لانے سے منکر رہے بلکہ اس معجزانہ طور پر وجود میں آنے والی اونٹنی کو قتل بھی کر دیا۔ اگر تاریخ میں کہیں یہ بھی درج ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ کے حکم پر عرب کے صحرا سرسبز وشاداب باغات میں تبدیل ہو گئے تھے، یا آپؐ آسمان سے سیڑھی لگا کر لوگوں کے سامنے الہامی کتاب لے کر آئے تھے، یا حضرت عیسیٰؑ کی طرح مردوں کو زندہ کر دیتے تھے تو اس صورت میں بھی ایسی تمام روایات کو یکبارگی یہ کہہ کر مسترد کر دیا جاتا کہ یہ محض مسلمانوں کے من گھڑت افسانے ہیں جو انہوں نے حضرت محمد ﷺ کو پیغمبر ثابت کرنے کیلئے گھڑے ہیں۔ تاریخی وقائع کو اندازوں اور ذاتی آراء کی بنا پر رد کرنے کا یہ طریقہ تحقیقی اصولوں کی واضح خلاف ورزی ہے۔

تاریخی وقائع کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت وکردار کو بھی نشانہ بنایا جاتا ہے۔ آپؐ کی دعوت وپیغام کے بارے میں یہ تاثر پیدا کیا جاتا ہے کہ وہ انسانی فکر وکاوش کا نتیجہ تھی اور اس کی بنیاد ذہنی وسائل پر تھی۔ انسانی فکر ونفسیات کے خواص کی بحث وکرید کر کے یہ ثابت کرنے کی بھی کوشش کی جاتی ہے کہ آپؐ کا خود کو پیغمبر سمجھ لینا ایک نفسیاتی کیفیت کا نتیجہ تھا۔ منٹگمری واٹ لکھتے ہیں کہ محمد کو مخلص قرار دینے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنے عقائد میں صحیح تھے ۔ ایک آدمی مخلص ہونے کے باوجود بھی غلط کر سکتا ہے۔ جدید مغرب سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کو یہ دکھانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی کہ محمد کس طرح غلط تھے۔ ممکن ہے کہ ایک شخص کو جو آواز اپنے باہر سے آتی سنائی دے، وہ درحقیقت اس کے لاشعور ہی سے آ رہی ہو۔ 33

مستشرق طور اینڈرے کے نزدیک اس قسم کا شخص نفسیاتی طور پر ایک مرتبہ سچی وحی کا حامل ہو سکتا ہے اور دوسری مرتبہ جھوٹی وحی کا، مگر اسے اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ ایسا دانستہ کر رہا ہے۔ اسلئے محمد (ﷺ) کی استقامت اور دینی اصابت تصدیق کرتی ہے کہ آپ کی شخصیت دنیا کے ان عیم لوگوں میں سے ایک ہے، جو اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ زندگی کی تعبیر ہیں، اسی لئے ان کا زندگی سے وجدانی اتصال ہو جاتا ہے اور ان کا وحی ربانی سے بھی ربط ہوتا ہے۔ اینڈرے کے نزدیک محمد (ﷺ) کی حقیقی عظمت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ آپؐ نے ایک یقینی صورت میں ایک جدید روحانی ترکیب پیش کی جو ان عناصر پر مشتمل ہے جو اس سے پہلے موجود تھے تاہم ان کیلئے ماضی سے مکمل طور پر انقطاع کرنا بھی ممکن ہو گیا۔ 34

ایسے افکار و خیالات پیش کر کے رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کے بارے میں شکوک و شبہات کا ایسا بیج بویا جاتا ہے جس کا مقصد آپؐ کی پیغمبرانہ حیثیت کو متنازعہ بنانا ہے۔ ایسے افکار سے نہ صرف غیر مسلم قاری کی خاص طرز پر ذہن سازی کی جاتی ہے بلکہ ناپختہ دینی بنیادوں کے حامل مسلمانوں کو بھی اس طور پر متاثر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ مصنفین کی تاویلات سے متاثر ہو کر آپ کو ایک پیغمبر کی بجائے زیادہ سے زیادہ ایک عظیم رہنما اور قرآن کو الہامی کتاب کی بجائے صرف ایک مذہبی کتاب کا درجہ دینے پر تیار ہو جائیں۔

مطلوبہ نتائج کے مطابق واقعات کا بیان

مستشرقین اکثر اپنے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کیلئے ضعیف اور شاذ روایات پر انحصار کرتے ہیں جو تنقید کی کسوٹی پر بے بنیاد ثابت ہوتی ہیں۔ مستشرقین نے اکثر ضعیف خبروں کو قبول کر کے ان کے مطابق فیصلے کئے ہیں، مشہور اور معروف روایتوں کے مقابلہ میں شاذ اور غریب روایتوں کو ترجیح دی ہے۔ کوئی روایت متاخر ہو، یا ماہرینِ نقد نے اس کی غرابت کا حکم دیا ہو، اگر وہ ان کے مطلوبہ مقاصد کو پورا کر رہی ہو تو اسے عقلی یا منطقی طور پر صحیح ثابت کرنے کیلئے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں، کیونکہ شبہات کی فضا پیدا کرنے میں وہی اُن کا واحد وسیلہ ہوتی ہیں۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں بیان ہوا اکثر مستشرقین اسلام کو یہودیت اور عیسائیت سے ماخوذ قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ اس مقصد کیلئے وہ ایسی چیدہ روایات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں جن سے آپؐ کا کسی یہودی یا نصرانی سے میل جول ثابت ہو۔ حضرت خدیجہ کے چچازاد بھائی اور نصرانی عالم ورقہ بن نوفل جن سے آپؐ کی پہلی وحی کے بعد ملاقات کا ذکر سیرت کی کتابوں میں ملتا ہے، ان کے کردار کو بہت ہی مبالغہ آمیز انداز میں پیش کیا جاتا ہے اس طور پر کہ انہیں آپؐ کی نبوت کا اصلی ماخذ قرار دیا جا سکے۔ منٹگمری واٹ لکھتے ہیں کہ توحید پر مبنی مذہب کی تلاش میں وہ تنہا نہیں تھے۔ قدیم عرب مذہب سے غیر مطمئن ایسے کئی افراد کا نام لیا جاتا ہے جو ایک نسبتاً زیادہ عقلی مذہب کی تلاش میں تھے۔ خصوصاً حضرت خدیجہؓ کے چچازاد بھائی حضرت ورقہ بن نوفل نے، جن کا سیرت کے ادب میں محمد (ﷺ) سے متعلق کئی دلچسپ کہانیوں میں تذکرہ آتا ہے، یقیناً طلوعِ اسلام میں اس سے کہیں زیادہ کردار ادا کیا ہو گا جس کا عام طور پر اقرار کیا جاتا ہے۔35

کتب سیرت سے ورقہ بن نوفل کے بارے میں جو روایات ملتی ہیں ان سے صرف چند مختصر ملاقاتوں کا ثبوت ملتا ہے جن کی بنا پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے دین اسلام کی "تشکیل" میں ایک بڑا کردار ادا کیا ہو گا۔ سیرت ابن ہشام کی روایت کے مطابق پہلی وحی کے نزول کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنھا ورقہ بن نوفل سے ملنے چلی گئیں۔ ورقہ بن نوفل نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا اور تورات وانجیل کی پیشین گوئیوں سے خوب اچھی طرح واقف تھے۔ جب حضرت خدیجہؓ نے ان سے وہ تمام باتیں کیں جو حضور ﷺ نے انہیں بتائی تھیں تو ورقہ نے ان سے کہا کہ اے خدیجہؓ! آپؐ نے جو کچھ مجھ سے بیان کیا ہے اگر وہ واقعی سچ ہے تو اُس ذات کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے ہاتھ میں ورقہ کی جان ہے کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا کرتا تھا اور وہ (محمد) بلاشبہ اس امت کے نبی
ہیں۔ حضور ﷺ جب اپنی عبادت کی مدت مکمل کر کے واپس لوٹے تو آپؐ کی ملاقات ورقہ بن نوفل سے طواف کے دوران ہوئی۔ ورقہ بن نوفل نے آپ سے کہا کہ جو کچھ آپؐ نے دیکھا اور سنا، وہ ذرا مجھے تو بتائیں۔ حضور اکرم ﷺ نے اُن سے ابتدائے وحی کا واقعہ بیان کیا تو انہوں نے کہا کہ بلاشبہ آپؐ کے پاس وہ فرشتہ آگیا جو موسیٰؑ کے پاس آیا کرتا تھا۔ اب آپؐ کا انکار کیا جائے گا۔ آپؐ کو جھوٹا کہا جائے گا۔ اذیتیں اور تکلیفیں دی جائیں گی یہاں تک کہ شہر سے باہر نکال دیا جائے گا اور پھر آپؐ سے باقاعدہ جنگ کی جائے گی۔ اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو میں ضرور آپ کی مدد کروں گا۔ پھر انہوں نے سر جھکا کر حضور کے سر کے درمیان میں بوسہ دیا اور حضور گھر تشریف لے آئے۔ 36 اس پورے واقعہ سے کسی طرح بھی یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ ورقہ بن نوفل نے آپ کو عیسائیت کے بارے میں اتنی معلومات دے دی ہوں گی کہ آپ اُن کی مدد سے ایک نیا مذہب اور شریعت پیش کر سکیں۔
مستشرقین کا ایک اور مطمع نظر آپ کی داعیانہ مساعی اور مصائب کو معمولی بنا کر پیش کرنا بھی ہے۔ مکی دور میں آپؐ کو جن اذیتوں اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا اُن کی تخفیف کر کے آپؐ کے کردار کی عظمت کو گھٹانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مثلاً ڈی۔ ایس۔ مارگولیتھ ایک مقام پر طنزاً لکھتے ہیں کہ ابو طالب کی وفات کے بعد آپ کو سر میں خاک ڈالے جانے جیسی "شدید" اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انہی تکالیف کے باعث آپ نے مکہ کو چھوڑ کر طائف میں پناہ ڈھونڈنا چاہی۔ تاہم اہل طائف اپنی دیویوں سے کچھ کم عقیدت نہیں رکھتے تھے۔ مارگولیتھ کے نزدیک آپؐ کا طائف سے آگے نہ جانا آپؐ کی محتاط اور بزدل شخصیت کا ثبوت تھا۔ 37

مکی دور میں رسول اللہ ﷺ کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا، ان سب کا خلاصہ محض "سر میں خاک پھینکے جانے" کی صورت میں بیان کر دینا کس حد تک درست ہے، اس کا جواب کتب سیرت میں واضح طور پر ملتا ہے۔ آپؐ نے اعلانیہ تبلیغ کے آغاز کے بعد زبانی وجسمانی ہر طرح کی تکالیف کا سامنا کیا۔ یہاں تک کہ آپؐ کو اس مشن سے باز رکھنے کے لئے بنو ہاشم کا تین سال تک ہر طرح کا معاشی ومعاشرتی مقاطعہ بھی کیا گیا۔ تاہم اس زبردست اور طویل امتحان کو بھی مستشرقین نے مبالغہ آمیز قرار دیا ہے۔38

قریش کی طرف سے پہنچنے والی ایذارسانیوں کی تخفیف کرنے کے ساتھ ساتھ اکثر مستشرقین نے قریش کی طرف سے آپؐ کے منصوبۂ قتل کا بھی انکار کیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے کردار کو کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ گویا آپؐ کی ہجرت کا مقصد محض ایک نئی جگہ جا کر کفارِ مکہ کے خلاف محاذ آرائی کا آغاز کرنا تھا۔ طور اینڈرے کے مطابق آپکی ہجرت ایک فرار تھا۔ اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کا مقصد آپؐ کو آپؐ کے قبیلوں والوں کی حمایت سے محروم کرنے کے بعد قتل کرنا تھا۔ تاہم محسوس یہی ہوتا ہے کہ ان کا مقصد آپؐ کو شہر تک محدود رکھنا تھا۔ خیال یہ ہے کہ وہ ان کے منصوبے جان گئے تھے اور اس بات کا ادراک کر لیا تھا کہ مدینہ کے حکمران کے طور پر وہ ایک خطرناک دشمن بن سکتے تھے۔ 39

منٹگمری واٹ نے بھی اس واقعہ کو مبالغہ آمیز قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ بعد کے واقعات سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ محمد ﷺ کو قتل کرنے کا کوئی قطعی منصوبہ نہیں بنایا گیا تھا۔ 40 سیرت ابن ہشام میں اس حوالے سے تفصیلی بیان موجود ہے کہ کس طرح کفارِ مکہ نے رسول اللہ کو ہجرت سے روکنے کیلئے دارالندوۃ میں جمع ہو کر باہم مشورہ کیا اور بالآخر رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کے منصوبے پر اتفاق ہوا۔ 41 طبری نے بھی بعینہ یہی روایت اپنی کتاب میں بیان کی ہے۔ 42 یہ کہنا کہ کفار مکہ نے صرف مستقبل میں رسول اللہ ﷺ سے ممکنہ محاذ آرائی کے پیش نظر یہ منصوبہ بنایا تھا جیسا کہ مستشرقین کی رائے ہے، اس لئے درست قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اس سے پہلے بھی وہ رسول اللہ ﷺ کو دعوت و تبلیغ سے روکنے کے لئے ہر ہتھکنڈا استعمال کر چکے تھے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ قریش کی طرف سے آپؐ کے چچا ابو طالب کو یہ پیشکش بھی کی گئی کہ وہ محمد کو ان کے حوالے کر دیں (تاکہ وہ انہیں قتل کر دیں) اور ان کے بدلے میں ایک خوبصورت اور طاقتور نوجوان عمارۃ بن الولید کو اپنا بیٹا بنالیں۔ اس پیشکش کو ابو طالب نے سختی سے رد کر دیا تھا۔ 43 اگر قریش صرف آپؐ سے ممکنہ خطرات کے پیش نظر آپؐ کو

قتل کرنے کے خواہشمند تھے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُس وقت انہوں نے آپ کو قتل کیوں کرنا چاہا جب آپ کی دعوت کا بالکل ابتدائی دور تھا اور آپ کے پیروکاروں کی تعداد بھی بہت زیادہ نہیں تھی اور نہ ہی اس وقت مسلمانوں نے مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ سیرت کے مصادر اس بات پر متفق ہیں کہ آپؐ کی قوم نے اس وقت ہی آپ کی مخالفت کا آغاز کر دیا تھا جب آپ نے ان کے بتوں پر تنقید کی اور انہیں بت پرستی سے باز آنے کی دعوت دی۔ قریش کی مخالفت کے اسباب میں صرف سیاسی و معاشی وجوہات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کے مترادف ہے۔

حوالہ جات وحواشی

[1]وَيَقُولُونَ أَئِنَّا لَتَارِكُوا آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُون (الصافات37:36) ترجمہ: اور کہتے تھے کہ بھلا ہم ایک دیوانے شاعر کے کہنے سے کہیں اپنے معبودوں کو چھوڑ دینے والے ہیں۔) إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ- وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلاً مَاتُؤْمِنُونَ – وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيْلاً مَاتَذَكَّرُون (الحاقۃ 69: 40-42) ترجمہ: یہ (قرآن) فرشتۂ عالی مقام کی زبان کا پیغام ہے۔ اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں۔ لیکن تم لوگ بہت ہی کم ایمان لاتے ہو۔ اور نہ ہی کسی کاہن کے مزخرفات ہیں۔ لیکن تم لوگ بہت کم فکر کرتے ہو۔)

[2]عبدالحمید صدیقی، اسلام کا نظریہ تاریخ، اعلیٰ پبلی کیشنز، لاہور، اشاعت سوم، 2000ء، ص:43

[3]عبد الرحمن الشرقاوی، محمد ﷺ رسول الحرية، دارالشروق، بيروت، الطبعة الأولىٰ، 1990م، ص:22

[4] محمد رسول الحرية، ص:31

[5]ایضاً، ص:32

[6]W. Montgomery Watt, Muhammad: Prophet and Statesman, Oxford University Press, United Kingdom,1961, p:14

[7]ابن هشام، السيرة النبوية، شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي، مصر، 1955م، ج:1، ص:235

[8]Tor Andrae, Theophil Menzel (Translator), Mohammed: The Man and his Faith, Harper&Brothers, New York, 1960, p:75

[9]الانعام 6: 160

[10] ابن كثير، السيرة النبوية، دارالمعرفة للطباعة والنشر والتوزيع، لبنان، بيروت، 1976م، ج:1، ص67- 71

[11]H.A.R.Gibb, Mohammedanism, Oxford University Press, New York, 1964, p:23

[12] W. Montgomery Watt, Muhammad At Mecca, Oxford University Press, UK , 2006, p:72-73

[13] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، دارطیبۃللنشروالتوزیع،1999ء، ج:8، ص:319

[14]D. S. Margoliouth, Mohammed and the Rise of Islam, G.P. Putnam's Sons, New York, 1905, p:165

[15]Dr. Ahmed Abu Zayd, Dr. Ahmed Chaabihi (Translator), The Life of the Prophet, ISESCO, Morocco, 2003, p:63

[16]Thomas Carlyle, Sartor Resartus and On Heroes and Hero Worship, Everyman's Library, London, 1965, p:289

[17]Karen Armstrong, Muhammad Prophet for our Time, Harper Collins Publishers, London, 2006, p:81

[18]John L.Esposito, Islam The Straight Path, Oxford University Press, New York, 1988, p:25

[19]محمد حسین ہیکل، ابو یحییٰ امام خان (مترجم)، حیات محمد، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، طبع دوم، 1968ء، ص:42

[20]حافظ عبد الغفار (مرتب)، سیرت النبی ﷺ اور مستشرقین، دارالنوادر، لاہور، 2015ء، ص:70-71

[21]شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبی ﷺ، الفیصل پبلشرز، لاہور، س ن، ج: 1-2، ص:112-113

[22]H.A.R.Gibb, Mohammedanism, p:25

[23]سر سید احمد خان، خطبات احمدیہ، ادارہ دعوۃ الفرقان، لاہور، س ن، ص:86

[24]W. Montgomery Watt, Muhammad At Mecca, p:xv

[25]Tor Andrae, Mohammed: The Man and His Faith, p:31

[26]Philip K.Hitti, Islam and the West, An Historical, Cultural Survey,D. Van Nostrand Company Inc., Princeton, New Jersey, 1962, p:14

[27]Ignaz Goldziher, Kate Chambers Seelye (Translator), Muhammad and Islam, Yale University Press, London, 1917, p:3

[28]The Encyclopedia of Islam, Leiden, New York, 1993, V:7, p:361

[29]D. S. Margoliouth, Mohammed and the Rise of Islam, p:237

[30]الکھف18: 110

[31]البقرۃ2: 253

[32]ابن کثیر، ابو طلحہ محمد اصغر مغل (مترجم)، حضور ﷺ کے معجزات، دارالاشاعت، کراچی، 2004ء، ص:39-101

[33]W. Montgomery Watt, Muhammad: Prophet and Statesman, Oxford University Press, London,1961, p:17

[34]Tor Andrae, Mohammed: The Man and His Faith, p:82

[35]W. Montgomery Watt, Muhammad: Prophet and Statesman, Oxford University Press, London,1961, p:363

[36]ابن ہشام،السیرۃالنبویۃ،شرکۃومطبعۃ مصطفیٰ البابیالحلبی،مصر،1955م، ج:1،ص:238

[37]D.S. Margoliouth, Mohammed and The Rise of Islam, p:178

[38]The Encyclopedia of Islam,V:7,p:365

[39]Tor Andrae, Mohammed: The Man and His Faith, p:135

[40]W. Montgomery Watt, Muhammad at Mecca, p:150

[41]ابن هشام، السیرۃالنبویۃ،ج:1،ص:482

[42]ابن جریر طبری ، تاریخ الرسل والملوک ،دارالتراث، بیروت، 1387ھ،ج:2،ص:372

[43]ابن هشام، السیرۃالنبویۃ،ج:1،ص:266-267